سید عبداللہ اور نقدِ قصیدہ

کلیدی الفاظ: انتقادی محاکمہ، علمی بصیرت، تنقیدی و تحقیقی شعور، مقدمات، تقاریظ

ڈاکٹر محمد معین الدین
شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ملخّص:

فنِ قصیدہ گوئی اور ناقدین قصیدہ کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ دونوں کی حیثیت لازم وملزوم کی ہے۔ یہ مفروضہ محض نقدِ قصیدہ پر ہی نافذ نہیں ہوتا بلکہ تمام اصناف ادب اور ان کے نقادوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کسی بھی ادب پارے کا مقام و مرتبہ تب تک متعین نہیں ہوتا جب تک کوئی تنقید نگار اس پر اپنی تحقیقی اور تنقیدی رائے کا اظہار نہ کرے۔ زمانہ شاہد ہے کہ اعلیٰ پائے کی تخلیقات اس باعث گمنامی کے اندھیرے میں چلی گئیں کہ ان پر کسی دانشور کی نگاہیں مرکوز نہ ہو سکیں۔ اس کی زندہ جاوید مثالیں ہمارے ادب میں موجود ہیں۔ بالخصوص دکنی ادبیات کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے وہ محققین و ناقدین کا ہی مرہونِ منت ہے۔ قصیدے پر جن لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے ان میں سب سے پہلے فائز دہلوی، حالی، شبلی، امداد امام اثر، کلیم الدین احمد وغیرہ جیسے دانشوران شامل ہیں۔ مگر گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ صنفِ قصیدہ کو زیادہ تر نقادوں نے ایک ہی پیمانوں پر پرکھنے کی کوشش کی۔ خواہ انھوں نے باضابطہ طور پر کتاب تصنیف

کی ہو یا پھر فرداً فرداً مضمون تحریر کیے ہوں۔ اکثر نقاد اسی بات پر زور دیتے رہے کہ قصیدہ میں فقط نوابین، سلاطین، امراء اور رؤسا کی مدح سرائی اور ان کی خوشامد پرستی ہوتی رہی۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ لسانی مطالعہ کر کے قصیدے کے پُرشکوہی مزاج اور اس کے سطوت وطمطراق اور رعب ودبدبہ سے بحث وتکرار کرتے رہے۔ مگر سید عبداللہ کا امتیاز اور تشخص یہ ہے کہ انھوں نے فنِ قصیدہ گوئی پر عام روش سے ہٹ کر گفتگو کی۔ انھوں نے حالی یا کلیم الدین احمد کی طرح قصیدے کے فن پر لعن طعن نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس صنفِ سخن پر اس طرح گفتگو کی ہے کہ اس کے لسانی وصرفی ونحوی پہلو بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور دوسری سب سے خاص بات یہ کہ انھوں نے قصیدے کو صرف مدح سرائی اور خوشامد پرستی پر محمول نہیں کیا بلکہ اس پہلو اور زاویے سے بھی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی کہ قصیدے ہماری سماجی، معاشی اور تاریخی نوعیت کے بھی غماز ہیں۔ قصیدوں سے ہم اُس دور کی تہذیب وتمدن اور تاریخی پہلوؤں کو بھی سمجھ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید عبداللہ کی قصیدہ تنقید مزید اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ قصیدے کی تنقید کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے سید عبداللہ کی تحریروں کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

اردو میں قصیدے کی تنقید کو ہم بنیادی طور پر چار زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اولاً وہ نقاد جو بنیادگزار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں مثلاً فائز دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، امداد امام اثر اور کلیم الدین احمد۔ دوسرے وہ ناقدین جو نقد قصیدہ کے باب میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں جیسے جلال الدین احمد

جعفری، ابومحمد سحر، محمود الٰہی اور ایم کمال الدین وغیرہ۔ یہ وہ تنقید نگار ہیں جنھوں نے دکن سے لے کر شمالی ہند تک اردو قصیدہ نگاری کا بالاستیعاب جائزہ لیا ہے اور قصیدے کی تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کی تحریریں نہایت اہم اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ تیسری نوعیت کے وہ نقاد ہیں جنھوں نے کسی ایک قصیدہ گو شاعر کا انتقادی محاکمہ کیا ہے اور اپنی علمی بصیرت اور تنقیدی و تحقیقی شعور سے فن کو کھنگالنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے نقادوں میں شیخ چاند، مولوی عبدالحق، ظہیر احمد صدیقی، تنویر احمد علوی، محمد حسن، خلیق انجم، سیدہ جعفر اور نورالحسن نقوی وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھے زمرے میں ان ناقدین قصیدہ کو شمار کیا جا سکتا ہے جن کے یہاں باضابطہ طور پر قصیدے کے تعلق سے کوئی کتاب تو نہیں ملتی مگر ان کی بعض تصانیف میں قصیدوں پر تنقیدی اظہار خیال مل جاتا ہے۔ مثلاً مقدمات، تقاریظ، دیباچے، پیش لفظ یا مجموعۂ مضامین میں شامل قصیدے پر کوئی مضمون یا اصناف سخن اور شعری ہیئتوں پر مشتمل کتابوں میں صنف قصیدہ کا تذکرہ یا تاریخ ادب کے تناظر میں قصیدے پر گفتگو۔ ایسے تنقید نگاروں میں ابواللیث صدیقی، نورالحسن ہاشمی، عبدالسلام ندوی، عبادت بریلوی، خورشید الاسلام، رشید حسن خان، علی جواد زیدی، شمیم احمد اور ظفر احمد صدیقی کے نام سرفہرست ہیں جن میں ایک مشہور و معروف نام سید عبداللہ کا بھی ہے۔

سید عبداللہ کی پیدائش ۵/اپریل ۱۹۰۶ کو موضع منگلور، ضلع مانسہرہ، صوبہ سرحد، غیر منقسم ہندوستان میں ہوئی تھی اور ۴/اگست ۱۹۸۶ کو لاہور میں ان کی انتقال ہوا۔ نقدِ میر، وجہی سے عبدالحق تک، مباحث، اشارات تنقید، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، اطراف غالب، مسائل اقبال اور ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ وغیرہ جیسی اہم تصانیف و تالیفات کے مالک سید عبداللہ کی شخصیت محتاج

تعارف نہیں۔زیر بحث موضوع کی رو سے ان کے یہاں کوئی مکمل تصنیف تو نہیں ملتی تاہم تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ان کی کتاب 'مباحث' کا آخری مضمون ''قصیدہ: ایک فن، ایک اسلوب تعمیر'' قصیدے کے باب میں ایک نہایت وقیع اور جامع بحث پر مشتمل ہے جس سے ہمارے بیشتر ناقدین قصیدہ نے استفادہ کیا ہے۔سید عبد اللہ نے اس مضمون میں قصیدے کے تاریخی و تہذیبی کردار پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔قصیدہ زمانہ قدیم کی ایک مخصوص تہذیب ہی نہیں بلکہ ایک مخصوص انداز حیات کا ادبی مظہر ہے۔ان کے نزدیک قصیدہ کا اصل کمال اس کی ترکیب وتعمیر میں ہے۔بعض علمائے ادب نے قصیدے کو نقاشی کا فن کہا مگر سید عبد اللہ اس کو ''معماری کا فن'' سمجھتے ہیں جس کے لیے نقاشی بھی لازم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک قصیدہ نگار کی فنکاری کا صحیح اظہار قصیدے کے مختلف اجزاء ترکیبی تشبیب، گریز، مدح ،طلب اور دعا کے حسن تعمیر میں ہی مضمر ہے۔سید عبد اللہ لکھتے ہیں ''مثنوی کے بعد (اور شاید اس سے بھی زیادہ) قصیدہ ہی وہ فن ہے جس میں شاعر معمار کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنی اس ذہانت کو استعمال میں لاتا ہے جو اختلاف اجزاء کے باوجود ہیئت کی وحدت پیدا کرتی ہے۔[۱]

تاریخ ادبیات کی ورق گردانی کے بعد اگر ایک طرف قصیدہ گوئی کی عظمت و برتری کا احساس کچھ یوں ہوتا ہے کہ قدمائے عرب کے شاعرانہ کمال کا انحصار ہی قصیدنگاری پر تھا، فارسی شاعری جس نے قصیدے کو معراج کمال تک پہنچایا اس صنف کے بغیر فارسی شعروادب کو نامکمل سمجھا گیا، اردو شاعری میں بھی بہ استثنائے آتش و ناسخ قصید کے فن سے نابلد شعراء کو غالب نے شاعر ہی نہیں مانا۔تو وہیں دوسری جانب یہ

صنف احساس کمتری کا شکار اس وقت ہوئی جب قصیدے پر جھوٹی مدح سرائی، مبالغہ، تصنع، ہوس پیشگی، خوشامد پسندی اور ضمیر فروشی جیسی لعنتیں اور ملامتیں اس قدر بھیجی جانے لگیں کہ بیسویں صدی کے اکثر شعرا نے خود کو مجروح سمجھتے ہوئے اپنے قصائد کو نیست و نابود کر دیا اور اس طرح ہمارے ادب کا ایک تابناک پہلو تاریک ہو گیا۔ کچھ اسی تناظر میں سید عبداللہ کا شکایتی انداز بھی قابل دید ہے کہ یہ عیب شماری کوئی نئی بات نہیں مگر قصیدے تک ہی کیوں محدود ہے؟ ان جیسے عیوب تو آج بھی رائج ہیں تو صرف قدیم قصائد ہی پر طعن و تشنیع کیوں کی جا رہی ہے؟ وہ لکھتے ہیں۔

> جو لوگ آج بھی ادب کو بیچتے ہیں یا جو لوگ ادب میں وہ روح ڈالتے ہیں جو خود ان کے احساس کی روح نہیں، وہ بھی تو لائق مذمت ہیں۔ ادیب کی شاید یہ ازلی ابدی بدقسمتی ہے کہ ضرورت مندی اس کا مقدر ہے اور یہ بات پرانے زمانے کی طرح نئے زمانے پر بھی صادق آتی ہے۔[۲]

مذکورہ اقتباس سے یہ سمجھنا زیادتی ہوگی کہ سید عبداللہ قصائد میں تصنع، ہوس پیشگی اور کذب آمیز مدح سرائی کو جائز قرار دیتے ہیں بلکہ وہ کسی حال میں اس عنصر کی تحسین کے قائل نہیں ہیں۔ البتہ وہ قصائد کو بلا سوچے سمجھے ہدف ملامت بنانا غلط سمجھتے ہیں۔ کیونکہ قصائد کا ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس میں بہت کچھ روایتاً اور رسماً لکھا جاتا تھا لہذا کم سے کم اس حصے کو تو عام ملامت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ دراصل سید عبداللہ قصیدے پر ہونے والی ان ملامتوں کا ذمہ دار حالی اور شبلی جیسے معماران نقد کو مانتے ہیں۔ راقم الحرف کے مطابق اتنی بڑی جرأت شاید کوئی دوسرا محقق یا نقاد نہ کر سکا۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اصل بات یہ ہے کہ جب سے شبلی اور حالی نے قصیدے کے خلاف لکھا ہے، قصیدے پر سوچے سمجھے بغیر لے دے ہور ہی ہی۔ (اور یہ بھی اس معرکہ انفعال یا ہنگامہ زبونی ہمت کا نتیجہ ہے جو اس صدی کے اوائل میں مغربی انتقاد کے زیر اثر ہمارے ادب کے خلاف بالعموم اٹھا تھا)۔[۳]

سید عبداللہ کی اِس رائے سے اتفاق پوری طرح ممکن نہیں کیونکہ اِن دونوں حضرات یعنی حالی و شبلی سے بہت پہلے فائز دہلوی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی آواز 'مدح مردم' کو مذموم سمجھنے والوں میں سب سے بلند ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق قصیدہ فی نفسہ برا نہیں بلکہ بعض شعراء اور ممدوحین کی بدولت ہی بے آبرو ہوا۔ مزید یہ کہ قصیدے کو علی الاطلاق برا کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ غزل بہت بری چیز ہے کیوں کہ لکھنؤ والوں نے اس میں 'محرم آب رواں' اور 'سینے کی نمودار چیزوں' کا ذکر کیا ہے۔ یہ باتیں تنقید کا حصہ تو نہیں ہوسکتیں البتہ تنقیص و تحقیر کا درجہ ضرور رکھتی ہیں۔ بہ ہر حال عیوب و نقائص کے باوجود قصیدے میں کچھ ایسے پہلو بھی ہوتے ہیں جو فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے مضامین اور شعری محرکات بھی ہوتے ہیں جو حقیقی شاعری میں شامل ہیں۔ مثلاً تشبیب میں غنائیت اور وصف نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں اور بسا اوقات مکالمے کے ذریعے تمثیلی رنگ اور ڈرامائی انداز پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مدحیہ حصے میں بھی وصف نگاری، جزئیات نگاری اور بیانیہ نگاری کی صورتیں نکل آتی ہیں۔ الغرض یہ کہ قصیدہ ایک ایسی مرکب صنف ہے جس میں بیانیہ، تمثیلیہ، وصفیہ اور غنائیہ شاعری کے اجزاء سبھی کچھ پائے جاتے ہیں۔

شکم پروری، خوشامد پسندی اور بھٹئی وغیرہ جیسے اعتراضات وارد کرنے سے قبل ناقدین حضرات نے شاید اس زاویے سے سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ اردو زبان میں قصیدہ جس دور میں پہنچا کیا وہ دور کسی قصیدہ گو کے لیے کوئی خاص منفعت بخش تھا؟ شاہانِ ہند، والیانِ ریاست اور نوابینِ وقت کے حالات کیا روز افزوں ناگفتہ بہ نہیں ہوتے جارہے تھے؟ ان بیچاروں کے پاس اتنی دولت کہاں تھی؟ جو قصیدہ گو یوں کا منہ سونے چاندی کے سکّوں سے اور ان کے دامن موتیوں سے بھر سکتے بلکہ ان کی بخشش وعطا اوس کے چند قطروں سے زیادہ نہ تھی۔ کیا ان چند قطروں سے ان قصیدہ نگاروں کی تشنگی کی سیرابی ممکن تھی؟ اس لیے یہ بات طے پائی ہے کہ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اس میں قصیدہ نگاری محض فن کی روایت کے طور پر پہونچی اور اس کی آبیاری بھی زیادہ تر فن پرستی کے جذبہ کے تحت ہوئی اور چونکہ قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں مدح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے اردو شاعروں نے بھی اس روایت کا احترام کیا، نہ یہ کہ صرف شکم پروری کا عنصر ہی ان پر غالب رہا۔ قصیدے میں مبالغے کے جواز کے سلسلے میں سید عبداللہ کا یہ استدلال دیکھیں:

> رہا مبالغہ سو وہ فی نفسہ شاعری کی شریعت میں جائز ہے، بعینہٖ اس طرح جیسے ایپک کے مافوق الفطرت عناصر ہیبت اور استعجاب کی فضا پیدا کر کے اس کے ماحول میں ایک خاص قسم کی سطوت کا احساس پیدا کرتے ہیں لہٰذا جائز ہیں۔ قصیدے میں اگر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے تو اصولاً اس میں کوئی خاص برائی نہیں۔ قصیدے کے میدان میں شاعر ایک لحاظ سے متحیر اور ششدر کر دینے والے استعجاب کو ابھارتا ہے جس سے اسے رعب اور دہشت کا اثر پیدا کرنا

مقصود ہوتا ہے اور یہ مبالغہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ [۴]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قصیدہ کا جو حسن و شان ہے وہ مبالغے کے بغیر ممکن نہیں اور یہ مبالغہ آرائی صرف قصیدے کا ہی حصہ نہیں بلکہ اساسی طور پر دیکھا جائے تو شعری اصناف کے علاوہ نثری اصناف بھی اس سے مبرّا نہیں ہیں۔ چنانچہ سید عبداللہ کا استدلال قصیدے میں مبالغے کے حق میں بے جا نہیں ہے۔ انھوں نے چند ایسے نئے نکات کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے جن کی طرف شاید ہی ہمارے ناقدین نے توجہ کی ہو اور وہ یہ کہ قصیدہ، آخر سطوت وطنطنہ، شوکت و طمطراق اور رعب و دبدبہ کا مصداق کیوں کر ہوا؟ قصیدے میں اس عنصر کے محرکات و عوامل کیا تھے؟ سید عبداللہ ان سوالوں کے جواب کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ در اصل فارسی قصیدے کو جس فضا اور ماحول میں فروغ حاصل ہوا، شان وطمطراق اور سطوت و دبدبہ اس دور کی تہذیب کا جزو خاص تھا، جو فن انشا کی طرح فن تعمیر میں بھی جلوہ گر تھا بلکہ سلجوقیوں، غزنویوں اور ترکیوں کے دور کی نقاشی اور مصوری بھی ان قصائد میں جا بجا نظر آتی ہے ۔ یہاں تک کہ سعدی و حافظ سے قبل کی ابتدائی غزلیں اور خاص طور سے صوفیانہ غزلیں بھی قصیدے کی سی آن بان اور نمود و شہود سے مزین ہیں۔ اس سلسلے میں سید عبداللہ کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> قدیم عربوں کے قصیدے وصف رجز اور حرکت زندگی سے لبریز ہوتے تھے۔ غزنویوں نے خراسان کو عرب کے نقوش سے زینت دینا چاہی، اس لیے فرخی نے داغ گاہ کا قصیدہ لکھا اور وصف کا حق ادا کیا مگر طمطراق پر اس نے بھی نظر رکھی۔ سلجوقیوں کے یہاں تحیر خیز

ہیبت اور رعب تعمیر کے عناصر پر اور بھی اضافہ ہوا اور لفظوں کے فلک بوس اہرام تیار ہوئے.....میرا گمان یہ ہے کہ ترکوں کا ذہن غزل کی نفاست اور نازکی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ان کی غزل میں بھی غلغلہ وولولہ اور رعب دار نوا ہوتی ہے۔(امیر خسرو کی غزل پر غور کیجیے؛ قصیدے کی سی گھن گرج کی مالک ہے) گویا ترکوں کے مزاج کا اصل رنگ قصیدے ہی میں کھلتا ہے۔ باقی رہی آرایش وزیبائش (صنعت گری) سو یہ تمام مسلمان اقوام کے ذوقی مزاج کا جزو لازم ہے۔سجع و قافیہ اور مرصع طرز بیان مسلمانوں کی انشا پردازی کا رنگ خاص ہے جو گونا گوں سماجی عوامل کے زیر اثر ترقی پذیر ہوکر اولین مترسلین سے شروع ہوکر ''مقاماتی'' ادب تک پہونچا.....اور پھر ٹھاٹھ کے عناصر کو ہمراہ لے کر ابوالفضل، ظہوری اور طغرائی اور اردو میں نوطرز مرصع اور آگے چل کر 'فسانہ عجائب' سے جاملا۔ [۵]

محولہ بالا اقتباس یہ واضح کرتا ہے کہ قصیدہ جن اقوام کے ذریعے ہم تک پہونچا، شان وشکوہ اور رعب ودبدبہ ان کے معمولات زندگی کا حصہ تھا جو مدتوں ہماری تہذیب وثقافت پر غالب رہا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اردو قصائد شوکت الفاظ اور بلند وبالا خیالات ومضامین سے بے نیاز رہتے۔ اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اردو کی تمام تر شعری اصناف، فارسی ادب کی دین ہیں مگر اس سے بھی

انکار کی گنجائش نہیں کہ اردو ادب نے فارسی سے اکتساب کرنے کے باوجود ہر صنف میں اپنا الگ اور مستقل نقش بھی قائم کیے ہیں۔ جس طرح اردو غزل کا مزاج اور اس کی داخلی روح فارسی غزل سے بالکل مختلف ہے اسی طرح ہندوستانی تہذیب وثقافت کے آمیزش نے اردو قصیدہ اور مرثیہ نگاری کو بھی ایرانی فضا سے مختلف بنا دیا ہے۔ یہ ان ناقدین کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو اردو ادب کو فارسی ادب کا بگڑا ہوا روپ سمجھتے ہیں اور جنھیں اپنی کم علمی یا کور چشمی کے سبب یہ نظر نہیں آتا کہ فارسی سے درآمد شدہ بیشتر اصنافِ سخن نے ہندوستانی فضا و ماحول سے ہم آہنگ ہو کر ایک جداگانہ طرز و انداز اختیار کر لیا ہے۔ اکتساب فیض اور پھر اس میں جداگانہ رنگ و نقش قائم کر دینا جیسے کمالات اردو قصیدہ نگاروں میں سودا کے علاوہ بالخصوص انشاء، ذوق، غالب اور محسن کاکوروی کے یہاں بہ خوبی دیکھے جا سکتے ہیں جنھوں نے فارسی اسالیب و مظاہر کی محض پیروی ہی نہیں کی بلکہ ہندوستانی رنگ و آہنگ کی آمیزش کر کے اس میں نئی نئی تلمیحات، استعارات اور تشبیہات بھی خلق کیے ہیں۔ اس طرح ہمارا اردو قصیدہ، نظم جیسی تفاصیل اور تسلسل مطالب کے لیے تختۂ مشق اور تجربہ گاہ بھی ثابت ہوا۔ جہاں تک تعلق ہے اردو قصیدے کے امام سودا کا تو وہ انوری، خاقانی اور عرفی کو استاد مانتے ہیں مگر اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے قصیدے کی ہیئت و تعمیر میں جن نئے تجربات و اختراعات کا ثبوت دیا ان کی بدولت نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا بلکہ اردو قصائد کے مزاج اور اسکی داخلی روح کو بھی بدل دیا ہے۔ جس کا اعتراف محمد حسین آزاد نے بھی اپنی کتاب 'آب حیات' میں یوں کیا ہے ''ان کے (سودا) کلام کا زور و اثر انوری و خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی و

ظہوری کو شرماتا ہے۔'' [۶] سید عبداللہ نے قصائد سودا کو ان شاعروں کے مقابلے میں بالکل الگ چیز قرار دیا ہے۔ مزید اس امر کی توضیح کے لیے ذیل کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> سودا جنھیں مصحفی نے ''نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ'' قرار دیا، انوری، خاقانی اور عرفی کو استاد مانتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ سودا کا قصیدہ اول الذکر دونوں شاعروں کے مقابلے میں الگ چیز ہے۔ اسے گھلاوٹ کہیں یا اردو شاعر کا بدلا ہوا تصور قصیدہ یا اس کا بدلا ہوا سماجی ماحول سمجھ لیجیے، مگر یہ امر واقعہ ہے کہ سودا کے قصیدے فارسی قصائد کا عکس محض نہیں۔ یہ تو نئے ماحول میں قصیدہ نگاری کے لیے نئے تجربوں کا درجہ رکھتے ہیں جن میں فارسیت کی جگہ ''اردویت'' کی روح پائی جاتی ہے۔ [۷]

مذکورہ اقتباس سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اردو قصیدے کا مزاج فارسی قصائد سے مختلف ہے۔ رہی بات سودا کی تو آج تک مصحفی کے اس فقرے ''نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ'' میں کوئی ایک لفظ کا حذف و اضافہ نہ کر سکا۔ لیکن بعض ناقدین کی یہ رائے کہ قصائد سودا میں کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جو فارسی قصائد سے بلند تر ہیں۔ یہ رائے محل نظر ہے اس سے اتفاق پوری طرح ممکن نہیں۔ سید عبداللہ کی نظر میں انوری و خاقانی کے یہاں امتیازی شئ عبارتوں کا شکوہ اور بیان کا جوش و خروش ہے جو سودا کے یہاں اصل شئ کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔ عرفی کے قصیدوں میں جوش انگیز استعاروں کی بہتات کے ساتھ ساتھ داخلی خروش بھی زیادہ ہے۔ لیکن شعرائے

مذکورین کے مقابلے میں سودا کا لہجہ اور اسلوبِ تعمیر قدرے انوکھا ضرور ہے مگر نرم اور دھیما ہے۔ مزید وضاحت کے لئے سید عبداللہ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

> سودا کے یہاں عبارت کا وہ شکوہ اور بیان کا وہ خروش اصل شی نہیں جو انوری و خاقانی کے یہاں اصل شی ہے۔ اور انوری وہی ہے جسے ابوالفضل نے ''ابوالاجداد عبارت'' یعنی پرشوکت سٹائل کا جد امجد کہا تھا۔ اس طرح خاقانی ترکیب سازوں کا بادشاہ تھا۔ اسی نے زبان کے بڑے بڑے ایوان مدائن تیار کیے تھے۔ عرفی کے یہاں بھی ایک آشوب ہے مگر ان دونوں کے مقابلے میں اس کی آواز نرم ہے اور اس پر مغلیہ تہذیب کی نفاست اثر کیے بغیر نہیں رہی ۔عرفی کے قصائد میں جوش انگیز استعارے بہت ہیں مگر ان میں داخلی خروش زیادہ ہے، خارجی گھن گرج کم ہے۔ مذکورہ بالا فارسی شاعروں کے مقابلے میں سودا کی آواز نرم ہے۔ (اور میر تقی بچارے تو صاف سرمہ در گلو معلوم ہوتے ہیں) تاہم اردو کے قصیدہ نگاروں میں اگر کسی کی آواز میں رعب ہے تو وہ سودا ہی ہیں۔ [۸]

مذکورہ اقتباس میں جو یہ بیان کیا گیا کہ فارسی شاعروں کے مقابلے میں سودا کی آواز نرم ہے یا ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کی طرح رعب دار نہیں۔ دراصل ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ دور تو ہر اعتبار سے دور اضمحلال تھا جہاں جوش وخروش اور رامش ورنگ کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور پھر سودا کے دور میں اردو زبان تشکیل و ارتقا کے جن مرحلوں کو عبور کر رہی تھی، کیا ان حالات میں ہماری زبان، فارسی جیسے

بھاری بھرکم لہجوں یا رعب دار تراکیب و استعارے کی متحمل ہوسکتی تھی ؟اردو زبان وادب کی اس تنگ دامانی اور بے سروسامانی کے باوجود بھی سودا نے قصیدے کی ہیئت و تعمیر میں جو تجربات و اختراعات کیے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا جو ثبوت دیا ہے،اس سے یقینا اردو قصیدہ نگاری کی شان وشوکت اور رعب وطنطنہ دوبالا ہوگیا ہے اور یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے فارسی سے ہیچ اور کمتر سمجھنا چاہیے؟ جبکہ اردو کے تمام قصیدہ نگار سودا ہی کے خوشہ چیں اور انہی کے قائم کردہ ایوان قصائد کا طواف آج بھی کررہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں بھی کرتے رہیں گے۔

شیخ چاند سے لے کر کلیم الدین تک قصیدے کی تنقید کا غالب رجحان یہی رہا ہے کہ قصائد کے اوصاف وخصائص کا انحصار استعارات وتشبیہات اور ردیف وقوافی کے حسن استعمال پر ہے۔دوسرے خارجی مظاہر پر توجہ خال خال ہی کی گئی جبکہ کسی بھی صنف کو سمجھنے اور اس کے بطن ومتن میں جھانکنے کے لئے کیا صرف علم بیان اور علم بدیع کا مطالعہ ہی کافی ہے؟ کیا قصیدے یا کسی بھی صنف کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے خارجی وداخلی عوامل ومحرکات اور ان سے وابستہ سماجیات وعمرانیات کا جاننا ضروری نہیں؟ یقینا ہے تبھی کہیں جاکر ہم فن سے انصاف کر سکتے ہیں۔سید عبد اللہ نے ان صفات وخصوصیات کی تلاش وجستجو کے وسائل میں کچھ نئے گل بوٹے بھی ٹانک دیے ہیں اور قصیدوں کے مطالعے کے لیے کچھ نئے زاویے بھی متعارف کرائے ہیں۔ان کے خیال میں قصائد سودا نے ایسا قلب ماہیت کیا کہ اردو قصیدہ نگاری کو نظم کے موجودہ تصورات سے قریب کردیا ہے ۔ سودا کے قصیدوں میں فارسی کی تیز وتند موسیقی نہیں بلکہ اس کی موسیقی دلوں میں رعب پیدا کرنے کے بجائے دل آویزی اور دل کشائی پیدا کرتی ہے۔غزلیں بھی ان کے قصیدوں میں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔یہاں

تک کہ تمثیل وتجسیم کی صورتیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور اس طرح اردو قصیدہ ایک نئی شکل وصورت اور نئی فضا سے آشنا ہو جاتا ہے۔ سودا کے بعد سید عبداللہ نے متعدد قصیدہ نگاروں پر بھی مختصر اظہار خیال کیا ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا کی ذہانت کے سبھی قائل ہیں۔ تقریباً تمام اصناف میں انھوں نے اپنی علمیت وذہانت کا رعب دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سید عبداللہ بھی ان کی اس فطرت سے نالاں ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ کوششیں ان کے قصیدوں میں سوائے غرابت کی کیفیت کے کچھ نہ پیدا کر سکیں۔ سید عبداللہ ان کے معروف 'قصیدہ نونیہ' کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی لفظیات میں لطافتِ آواز اور نزاکتِ انداز کی کثرت ہے جسے قصیدہ وغزل کی آمیزش کہنا بجا ہوگا۔ ان کی نظر میں محسن کاکوروی کے قصیدۂ نعتیہ میں بھی نظم وغزل ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ غالب کے قصیدے ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' میں بھی ڈرامائی اور مکالماتی نظم کا اندز ملتا ہے۔ ان میں اصلی قصیدے کی خصوصیات بہت کم ہیں۔ سید عبداللہ کے یہ خیالات ہمیں غالب اور محسن کاکوروی کے قصیدوں کے تعلق سے غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں دو رائے نہیں کہ محسن کے نعتیہ قصیدوں میں واقعی غزل کے عناصر پائے جاتے ہیں اور یہ پہلو بھی صداقت پر مبنی ہے کہ غالب کے قصیدے میں ایک ڈرامائی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ اس موقع پر سید عبداللہ نے مولانا عبدالسلام ندوی کی اس نصیحت کا بھی ذکر کیا ہے جو تمام قصیدہ نگاروں کو کی گئی تھی کہ ''تشبیب میں شاعر کو یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ خالص غزل کہنے نہیں بیٹھا ہے''۔ پھر اس نصیحت کا جواب سید عبداللہ نے کچھ اس طرح لکھا ہے ''مگر اس کا کیا علاج کہ ہندوستان کے ماحول میں قصیدہ روز

بروز نرم ہوتا گیا اور طبائع نے اس کو اظہار و بیان کے نئے راستوں پر ڈال دیا اور یہ چیز ہندوستان کی آب و ہوا اور یہاں کے عام اسلوب حیات کے عین مطابق تھی''۔ [9]

گویا ہندوستانی قصیدوں میں طمطراق و غلغلہ اور رعب و دبدبہ کے بجائے نرم لہجہ، لطافت اسلوب اور نزاکت الفاظ کا ہونا یہاں کی آب ہوا اور عام زندگی کا فطری و طبعی تقاضا تھا۔ چنانچہ ہمیں فن قصیدہ گوئی کو ایرانی تناظر میں نہیں پرکھنا چاہئے بلکہ ہندوستانی ماحول و فضا کی روشنی میں قصیدوں کا محاکمہ کرنا چاہئے۔

ذوقؔ کے متعلق سید عبداللہ بڑی بے باک رائے رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ ذوق نے سودا بننے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ سودا نہ بن سکے۔ انھوں نے بھی چند قصیدوں میں مشکل علمی اصطلاحات اور ادق تشبیہات و استعارات سے علم کا رعب و دبدبہ جمانے کی کوشش کی اور بعض میں ان کا مطمح نظر فقط خواب آلود موسیقی تک محدود معلوم ہوتا ہے۔ ذوق کے قصیدوں کے مصرعوں سے مثالیں بھی سید عبداللہ نے یوں پیش کی ہیں:

ع : ہے آج یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق

ع : صبح سعادت نور ارادت تن بر یاضت دل بہ تمنا

ع : شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت

سید عبد اللہ کی نگاہ میں غالب کے مقابلے قصائد ذوق میں تعمیر کا تجربہ کم ملتا ہے۔ البتہ وہ الفاظ و قوافی اور تراکیب و ردیف سے اس طرح قصیدے کی بنیاد ڈالتے ہیں کہ حیرت انگیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر دل پر رعب طاری ہو جاتا ہے مگر الفاظ و اصطلاحات کی کثرت کا، نہ کہ تعمیر کی ہیئت یا پر جوش اور اثر انگیز موسیقی کا۔ موصوف نے ذوق و غالب کے تعلق سے یہ تقابلی باتیں صرف ہوا میں ہی نہیں کیں بلکہ ان کی یہ باتیں استدلال و منطق پر مبنی ہیں۔ جن حضرات نے

ذوق و غالب کے قصیدے پڑھے ہیں اور ان کے بین السطور میں غوطہ لگانے کی کوشش کی ہے وہ ضرور سید عبداللہ کے بیان کی تائید کریں گے۔

غالب کے اردو قصیدوں کے متعلق سید عبداللہ کی رائے ہے کہ ان میں اصلی قصیدے کی خصوصیات ان کے فارسی قصیدوں کے مقابلے کم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں''(غالب کے فارسی قصائد میں واقعاتی اور فلسفیانہ عنصر زیادہ ہے اور کچھ رعب داب بھی ہے، مگر اردو کے قصیدے لطیف اور نرم و نازک ہیں اور دھیمی موسیقی کے رامش گر ہیں) مگر یہ نظر انداز نہیں ہوسکتا کہ ان کے یہاں تعمیر و ترکیب کے عمدہ نمونے ہیں''۔[۱۰]

بیان کیا جاچکا ہے کہ محسن کاکوروی کے قصیدوں میں نظم و غزل کا اجتماع ہے ذیل کا اقتباس ان کے قصائد بالخصوص قصیدۂ لامیہ کے تئیں سید عبداللہ کے نظریے کی مزید وضاحت کرے گا:

> محسن کاکوروی کے قصیدہ لامیہ نعتیہ میں تضاد و تقابل کے اندر سے ایک خاص رنگ پیدا کیا گیا ہے جو ساری نظم میں رواں دواں ہے۔ یہ قصیدہ بھی بڑے زور کا ہے مگر اس کی لَے میں نرمی اور ملائمیت ہے۔ البتہ لفظیات اور تصور کی جدت تعجب میں ڈال دیتی ہے اور قاری کو عجیب قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ مگر یہ قصیدہ یک جز ہے۔ اس میں اجزاء نہیں لہٰذا اس میں اجزاء کی ترکیب و تعمیر کی کاری گری بھی نہیں ہے۔[۱۱]

سید عبداللہ مذکورہ اقتباس میں جہاں قصیدۂ زیر بحث پر اظہار خیال کرتے ہیں تو وہیں وہ اسماعیل میرٹھی کو دیگر قصیدہ نگاروں کے مقابلے میں قصیدہ گوئی کے رموز

واسرار کا بڑا واقف کار سمجھتے ہیں۔ ان کے قصیدے 'جریدۂ عبرت' اور 'نوائے زمستاں' کو واقعاتی اور مقصدی نظموں سے تعبیر کرتے ہیں مگر اجزائے ترکیبی کی پیوند کاری اور ان کی ترکیب وتعمیر کی بنیاد پر ہی انھیں قصیدہ بھی گردانتے ہیں۔ یعنی سید عبداللہ کے نزدیک اسماعیل میرٹھی ایک ایسے قصیدہ گو ہیں جن کے قصیدوں کو نظم اور قصیدے کے بیچ کی کڑی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نوعیت سے اسماعیل میرٹھی کے قصیدے بھی تعمیری اعتبار سے غالب کی قصیدہ گوئی کے قریب ہو جاتے ہیں۔

بہر حال سید عبداللہ کی نظر میں اردو قصیدوں کا عمومی طور پر حال یہی ہے کہ بعض غزل سے قریب تو بعض قصیدے سے قریب تر ہیں۔ مکمل یا غیر معمولی قصیدے بہت کم ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں سید عبداللہ کے 'غزل سے قریب تر' والے نظریے کا انطباق مولانا محمد حسین آزاد کی 'تحریکِ نظم جدید' کے زیر اثر لکھے گئے قصیدوں پر تو کیا جا سکتا ہے لیکن قدیم قصائد پر نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے مضمون کے اختتامیہ میں سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ قصیدہ جیسی صنف شاعری کی خوبیوں کو متعصب نگاہوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ اقتباس دیکھیے:

> .....حالانکہ اس میں شاعرانہ تعمیر کے اچھے اچھے نمونے موجود ہیں اور مثنوی کے بعد قدیم زمانے کی یہی ایک صنف ہے جس میں مسلسل بیانات، سماجی احوال اور خارجی کوائف کا عموماً کامیاب اظہار ہوا ہے اور وسیلۂ توسیع زبان ہونے کے علاوہ اس میں شاعرانہ عمارت گری کی ایسی کوششیں ظہور میں آئی ہیں جن کو یونہی پھینک دینا ادبی جستجو کے صحیح ذوق کے سخت منافی ہے۔ [۱۲]

پوری بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید عبداللہ نے قصیدوں کے مطالعے میں جن تنقیدی مثبت رویوں کا ثبوت دیا ہے ان کی مثال ناقدین متقدمین ومتاخرین کے یہاں ملنی مشکل ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے قصیدے کے حوالے سے موجودہ تمام تنقیدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف اُنہی مخصوص چیزوں کا ذکر کیا ہے جو اوروں سے رہ گئی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ناقدین جن کی تنقیدیں استعاروں، تشبیہوں، ردیفوں اور قافیوں تک محدود تھیں ان سے ہٹ کر قصیدے کی تعمیر وترکیب ،قصیدے کا غزل میں خلط ملط ہو جانا، قصیدوں میں شوکت وطمطراق کی بنیادی وجوہات ،قصیدے کو ہوس پیشگی، خوشامد پرستی کی بنا پر نظر انداز کر دینا اور قصیدہ کے خلاف شبلی وحالی کے رویوں پر بعد کے ناقدین کا بھیڑ چال چلنا یا لکیر کا فقیر ہونا وغیرہ جیسے موضوعات پر بے باک اور بغیر کسی کی تردید کیے ہوئے جو طریقہ کار سید عبداللہ نے اپنایا ہے ان میں کہیں بھی دیگر ناقدین جیسی تکرار نظر نہیں آتی۔تصنع اور تکلف سے پاک اسلوب وزبان کا استعمال بھی انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ عوام وخواص یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔ضرورت ہے کہ قصیدے کے فن کو از سرِ نو جدید تنقیدی زاویوں کے تحت پرکھا جائے تا کہ فنِ قصیدہ گوئی کو جلا مل سکے، کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ قصیدوں میں صرف ممدوحین کی مدح سرائی ہے بلکہ قصیدے فنون لطیفہ کی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنے دور، سماج ومعاشرت، تہذیب وثقافت، تاریخ وسیاست کی عکاسی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔لہٰذا اس حیثیت سے اردو قصائد ہمارے تاریخی، سیاسی، سماجی اور عمرانی مآخذ کا اہم حصہ بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

کلیدی الفاظ: انتقادی محاکمہ، علمی بصیرت، تنقیدی و تحقیقی شعور، مقدمات، تقاریظ، نقاشی کا فن، معماری کا فن، ہیئت کی وحدت، اسلوبِ تعمیر، اندازِ حیات، ادبی مظہر، ہوس پیشگی، احساس کمتری، طعن و تشنیع، کذب آمیز، ہدفِ ملامت، معمارانِ نقد، تنقیص و تحقیر، شعری محرکات، غنائیت، وصف نگاری، مرکب صنف، تمثیلی رنگ، شکم پروری، منفعت بخش، شاہانِ ہند، والیانِ ریاست، نوابینِ وقت، روز افزوں، ناگفتہ بہ، محرکات و عوامل، محرم آب رواں، علی الاطلاق، معرکۂ انفعال، ہنگامۂ زبونیٔ ہمت، سطوت و طنطنہ، شوکت و طمطراق، تمثیل و تجسیم، ادق، خواب آلود موسیقی۔

حواشی و حوالے:

۱۔ سیّد عبداللہ، مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبعِ اول، ۱۹۶۵ء، ص ۵۹۷

۲۔ ایضاً، ص ۵۹۳

۳۔ ایضاً، ص ۵۹۳

۴۔ ایضاً، ص ۵۹۶

۵۔ ایضاً، ص ۵۹۵

۶۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، طبعِ ششم، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۵

۷۔ سیّد عبداللہ، مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبعِ اول، ۱۹۶۵ء، ص ۵۹۹۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۹۹۔۶۰۰

۹۔ ایضاً، ص ۶۰۴۔۶۰۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۰۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۰۶